اردو میں منظوم تراجم کی روایت

اظہار احمد

محمد آصف اعوان

Abstract:

Translation has become as one of the most important and fundamental needs of modern era. Humanity has utilized the art of translation in order to meet its religious, social and financial needs in each and every era.The scope of Urdu language is enriched with different translations which certainly begins with the translations of Holy Quran. After that the process kept on enriching other fields of knowledge and literature. During the course of translation master pieces of prose and poetry of other languages were transformed into Urdu. Ali Garh College, Dehli College and Dar-ul-Tarjuma Usmania contributed well in this regard. "Makhzan" has also played vital role as far as the poetical translations are concerned. The poetical Urdu translations are indebted and obliged by the great work of Allama Muhammad Iqbal, Muhammad Hussain Azad, Ameer Chand Bahar, Syed Shakir Ali and Syed Ali Hasnain Naqvi. This tradition of poetical Urdu translations from classical and modern western poetry collection is still flourishing and progressing with full pace and in desired direction. This tradition/process is helping the quantity of Urdu poetry and more importantly this art is heading towards the desired destination of maturity and growth.

ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ترجمہ ہی ہے جو کسی زبان کے ادبی و علمی فن پاروں کو پورے معنی و مفہوم سمیت دوسری زبان میں منتقل کر کے علمی سرمائے میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔یوں ترجمہ کی اہمیت و ضرورت ہمیشہ سے ہے اور اس میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ترجمہ کی ضرورت بنیادی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ ترجمہ ہی ہے جو کسی بھی قوم کے علوم کا دائرہ وسیع کرنے میں مدد گار ہوتا ہے۔

ترجمہ کی مدد سے قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں کیونکہ یہی راستہ ہے جس پر چل کر کوئی بھی قوم علم و فن کے تمام تر امکانات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے ترجمہ ایک ایسا دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال کھلتے ہیں یوں ترجمہ جدید عہد میں ایک اہم اور بنیادی ضرورت بن کر ابھرا ہے اور آج ترجمہ کا فن اتنا اہم ہو چکا ہے کہ اس کے بغیر ہم لوگ عالمی سطح پر ہونے والی کسی بھی طرح کی علمی و ادبی سر گرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔

ترجمہ وہ فن ہے جس سے نہ صرف دوسرے ممالک اور ان کے علمی و ادبی سرمائے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے بلکہ خود ہماری زبان کو بھی بے بہا فائدہ پہنچا ہے کیونکہ دنیا کی مختلف زبانیں اپنا مختلف علمی، ادبی، تہذیبی اور معاشرتی سرمایہ رکھتی ہیں۔ان کے ہاں مختلف موضوعات ملتے ہیں اور یوں جب ہم ان زبانوں میں موجود علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں تو ترجمے کے عمل کے دوران بہت سے نئے الفاظ ،اصطلاحات ، محاورات ،روز مرہ اور مترادفات کی صورت تلاش کرتے ہیں جس سے نہ صرف دوسری زبان کے ذخیرہ الفاظ کا اندازہ ہوتا ہے اور مترجم کو مختلف زبانوں کے الفاظ کا علم ہوتا ہے بلکہ اپنی زبان میں ترجمہ کرنے سے اپنی زبان میں ذخیرہ الفاظ کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔اس حوالے سے جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> "ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے ،خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے لیے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔نئے الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں۔پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں۔"(۱)

اس طرح ترجمہ یقیناً زبان کی گہرائی اور علمی وسعت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ترجمہ علوم و فنون میں اضافہ کرتا ہے۔علوم و فنون کسی بھی قوم کی میراث نہیں ہوتے بلکہ

پوری نسل انسانی کے لیے یہ یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ دنیا میں بے شمار اقوام ہیں اسی طرح علم کے شعبے میں بھی بے پناہ وسعت ملتی ہے۔ انسان چاہے کسی بھی خطہ زمین اور قوم سے تعلق رکھتا ہو اسے علم کے حصول کی مکمل آزادی اور حق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نئے علوم اور نظریات کی ضرورت ہر قوم کو ہوتی ہے کیونکہ اس سے ہی تخلیقی سطح پر جمود ٹوٹتا ہے اور نئے خیالات و تصورات سے زبان کو بھی ترقی ملتی ہے۔ دنیا کی دیگر اقوام علم کے جس جس شعبے میں تحقیق کر رہے ہیں اور اور نئے سے نئے نظریات بنا رہے ہیں، اب ان سے واقفیت کا ایک ہی راستہ ہے جو ترجمہ کا ہے۔ اس حوالے سے شہباز حسین لکھتے ہیں:

> "ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم و فنون کے خزانے سب کے لیے کھل جاتے ہیں۔ اسی لیے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔"(۲)

اس طرح ترجمہ کے ذریعہ وہ غیر ملکی علوم و فنون جب ہماری زبان میں منتقل ہوتے ہیں تو اس سے نہ صرف ہمارے علمی سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ترقی کی نئی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ علم کی جستجو و تلاش کو تو بالخصوص مسلمانوں کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن واحادیث میں اس حوالے سے بے شمار احکامات ملتے ہیں کہ علم کی تلاش میں سرگرداں رہو اور جہاں سے بھی علم ملے اس کو حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرو اور جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھاؤ۔ حدیث مبارکہ ہے :"علم مومن کی گمشدہ میراث ہے۔" لہذا مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کی تلاش میں ہمیشہ متحرک اور سرگرداں رہے اور اس علم کے حصول سے اپنے ملک و قوم کی ترقی کا ذریعہ بنے۔ اس لیے غیر ملکی زبانوں میں موجود علم کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ترجمہ ہی بنتا ہے جس کے ذریعے اقوام عالمی تناظر میں تحقیقی کاموں میں ایک دوسرے سے کسبِ فیض کرتی ہیں۔ ترجمہ انتہائی ناگزیر وسیلہ ہے ان علوم تک پہنچنے کے لیے جو دوسری زبان میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اور یوں ترجمہ ادب عالیہ سے واقفیت کا بھی باعث بنتا ہے۔ ادب جو کسی بھی ملک و قوم کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کی تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تراجم کے ذریعے ادب عالیہ کے شاہکار جب دوسری زبان میں منتقل کیے جاتے ہیں تو اس سے انسانی ذہن ان سرحدی فاصلوں کو مٹا دیتا ہے جو بیچ میں حائل ہوتے ہیں۔ یوں انسانوں کے درمیان ترجمہ یکجہتی اور اپنائیت کا باعث بنتا ہے۔ ادبی تخلیقات چاہے وہ کسی بھی صنف سے تعلق رکھتی ہوں ان سے اس معاشرے کے ذہنی و فکری ارتقا کا بھی پتہ چلتا ہے جس سے وہ تعلق رکھتی ہیں۔ وہاں کے سماج میں فرد اور اس کے باطن کی کہانی بھی معلوم ہو جاتی

ہے اور ہماری اپنی زبان کے تخلیقی ادب میں نئی تازگی اور تحرک بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ادب پر کسی ملک یا قوم کا اجارہ نہیں ہوتا ہے۔ ترجمہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے سے تخلیقات کو نئی زندگی ملتی رہتی ہے اور اس کے اثرات عالمگیر سطح تک پہنچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تراجم سے دیگر اقوام کے تمدن اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں اور ترجمہ دو مختلف تہذیبوں کے ملاپ کو بھی ممکن بناتا ہے اور دو اجنبی اقوام کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ اس حوالے سے جیلانی کامران لکھتے ہیں:

"قومیں اور تہذیبیں، مسافت اور جغرافیے کی دقتوں کے باوجود ایک دوسرے سے آشنا ہوتی ہیں اور انسانوں کے گروہ مختلف دوسرے گروہوں کو پہچاننے لگتے ہیں اور انسانی برادری کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس کی جانب انسان ہمیشہ سے سفر کر رہا ہے۔"(۳)

ترجمہ اقوام عالم کے درمیان انسانیت، شناسائی کے در وا کرتا ہے اور اجنبیت کی اس دیوار کو گراتا ہے جو مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف تہذیبی پس منظر رکھنے والوں کے درمیان حائل ہوتی ہیں اور یوں ایک دوسرے سے میلوں دور رہنے والے ترجمہ کے ذریعے ایک دوسرے کے ادب و ثقافت اور جذبات سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے حاجی احمد فخری لکھتے ہیں:

"تراجم کا عمل انسانی تمدن اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا ایک بھرپور ذریعہ ہے انسان جو رنگوں، زبانوں اور جغرافیائی بندشوں، سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے۔"(۴)

احمد فخری کا بیان ترجمے کی اہمیت کو عصر حاضر میں ثابت کرتا ہے۔ خصوصاً جب کہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن رہی ہے اور اب تمام دنیا کے انسانوں کو قریب لانے کے لیے ایک اہم ذریعہ ترجمہ ہے۔ مذکورہ تمام حقائق سے ترجمہ کی اہمیت و افادیت واضح ہوتی ہے۔ ترجمہ علوم وفنون، تہذیب و تمدن، ثقافت، حقائق اور اقوام کے درمیان موجود فاصلے ختم کرتا ہے اور ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ وہ علوم جو اجنبی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ ترجمہ کے بعد وہی باعث فہم بن جاتے ہیں۔ ترجمہ آج کے جدید دور اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں ہماری ترقی و استحکام کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور ترقی کے بہت سے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ ترجمہ کا فن اور مترجم کسی بھی معاشرے کی سیاسی، سماجی، ادبی ساکھ کو مستحکم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور ضروری ہے کہ

بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کے فن کو ترقی و ترویج دی جائے کیونکہ اسی سے تخلیقی جمود بھی ٹوٹے گا۔ علم و ادب کے نئے راستے بھی کھلیں گے۔ فکر کو بلندی اور ملک و قوم کو استحکام بھی حاصل ہو گا۔ اور ہم جدید دور میں ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ ساتھ مل کر قدم بڑھا سکیں گے۔

ترجمہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسان کی ہے۔ ہر دور میں انسان نے اپنی مختلف سماجی، معاشی اور مذہبی ضروریات کی وجہ سے ایک دوسرے سے روابط بنانے اور انہیں دوام دینے کی کوشش کی ہے۔ انسان نے سب سے پہلے مذہب کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے تبلیغ کی غرض سے ترجمہ کی راہ اختیار کی اور اس حوالے سے اپنی مذہبی کتب کو اور تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے دوسری زبانوں میں منتقل کیا یوں ترجمہ کے ذریعے سب سے پہلے دنیا بالخصوص یورپ میں عیسائیت کا پرچار کیا گیا اور انجیل مقدس کے ابتدائی تراجم اس کی مثال ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ ادبی و علمی تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور دنیا کا قدیم ترین ادبی ترجمہ ہومر کی "اوڈیسی" کا یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ یہ تراجم کا ابتدائی دور تھا لہذا مترجم کو وہ حیثیت حاصل نہ تھی جو آج کے دور میں حاصل ہے لیکن یہ واضح ہے کہ ہومر کا یہ ترجمہ آج تخلیق کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ادبی و علمی سطح پر نئے علوم اور موضوعات کی ضرورت محسوس کی گئی تب بھی ترجمہ ہی اس کا ذریعہ بنا اور یوں علوم کا بے بہا سرمایہ ترجمہ ہونے لگا۔

یورپ میں تراجم کا آغاز رومیوں نے کیا تھا لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام عالم نے بھی اس فن کی اہمیت و ضرورت کو سمجھتے ہوئے توجہ دی اور مسلمانوں میں مامون الرشید نے سرہانی، پہلوی، یونانی اور سنسکرت سے مختلف علوم و فنون کو عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر ارسطو، افلاطون، بقراط کا علم بھی عربی ادب میں گرانقدر اضافے کا باعث بنا۔ بعض ازاں یونانی فلسفے کو جب ترویج ملی تو اس میں بھی بنیادی طور پر ابن ماجہ، ابن رشد کے تراجم نے اہم کردار ادا کیا پھر امیر معاویہ کے عہد میں بھی یونانی طب کی کتب کو عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تراجم کی اہمیت دولت عباسیہ تک پہنچ گئی۔ اس حوالے سے اہم تراجم ہوئے جن کے حوالے سے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> "اس دور کا سب سے اہم مترجم عبداللہ بن المقفع تھا جس نے سنسکرت، پنچ تنتر اور پہلوی، کلیلہ ورمنک کا عربی میں ترجمہ کر کے، "کلیلہ ورمنہ"، نام رکھا۔ اس کے

فارسی سے کیے گئے دیگر تراجم میں اہرانی تاریخ کی نادر کتابیں خصوصاً "آئین نامہ "یزدک نامہ"، "نوشیرواں نامہ"، یادگار ہیں۔"(۵)

عربی میں کیے گئے یہ تراجم آج بھی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ بعد ازاں خلیفہ ہارون الرشید نے بھی دارلترجمہ قائم کیا۔ اس کے دو بڑے مترجم فضل بن نوبخت مجوسی اور یوحنا بن ماسویہ ہیں۔ عراق میں افسانوی ادب کی ابتداء میں الف لیلہ اور قدیم حکایات و قصص کے تراجم کا اہم کردار ہے۔ تراجم کا اثر چونکہ تمام دنیا اور اس کے ادب پر رہا تھا تو اس حوالے سے چین میں سماجی حوالے سے جہاں کتب کے تراجم ہوئے وہیں جیمز لیگی (James Legge) چینی شاعری کے اولین مترجم کے طور پر سامنے آئے۔ پھر روس میں جو ادب تخلیق ہوا اس کے تخلیق کاروں میں پیشکن، گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف اور گوگول کے ناموں سے آج اگر واقف ہیں تو یہ ترجمہ کی ہی مرہون منت ہے۔

ترجمہ کی تاریخ میں یونان کا نام نمایاں اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ یونانی ادب اور نظریات ہی تھے جنہوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا۔ یونانی رزمیے ہومر، ایلیڈ، ہویا اور اوڈیسی ان کا اثر آج تک ظاہر ہے اور یورپ میں جو رومانی قصے تخلیق ہوئے ان پر یونان کے ادب ہی کا اثر نظر آتا ہے۔

ترجمہ کی تاریخ میں اٹھارویں صدی میں فرانس کا ادبیات عالم میں تراجم کی وجہ سے نمایاں رہا اس میں فرانسیسی ادب روسو اور والٹیئر نے دنیا بھر میں شہرت پائی۔ پھر شیکسپیئر کے ڈرامے تراجم کے ذریعے ہی مشرق میں آئے اور آج ان کو فن ڈرامہ نگاری کے ضمن میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے علوم و فنون چاہے وہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہیں یا زبان میں تخلیق کیے گئے تراجم کی بدولت تمام دنیا تک پہنچے۔

تراجم کا یہ سلسلہ برصغیر تک پہنچا اور یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں مغلیہ حکومت قائم تھی۔ اس دور میں ہندوستان کی زبان فارسی تھی اور اکبر بادشاہ کو سنسکرت سے لگاؤ تھا اس لیے اس نے اس ابتدائی طور پر ریاضی، الجبرا، فلسفہ اور شاعری کی بہت سی کتب کے تراجم فارسی میں کروائے تھے۔ ان میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ "خرد افروز" لیلاوتی، نل دمن، سدھاونت شامل ہیں۔ ان تراجم میں پنچ تنتر کا ترجمہ "کلیلہ ودمنہ" بھی نمایاں ہے۔

مذہبی حوالے سے سب سے پہلے شاہ ولی اللہ نے قرآن پاک کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا بعد ازاں قرآن پاک کے اردو تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فاخرہ نورین لکھتی ہیں: "شاہ

شفیع الدین نے قریباً ۱۷۷۶ء میں یہ ترجمہ کیا اس کے چند سال بعد ۱۷۹۵ء میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادر نے بھی مقابلتاً رواں اور بہتر ترجمہ قرآن کیا۔"(۶)

مذہبی تراجم کے حوالے سے فارسی اور اردو زبان میں کیے گئے یہ تراجم آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔بعد ازاں ڈپٹی نذیر احمد نے بھی ترجمہ قرآن پاک کیا۔ اس کے بعد داستانوی ادب میں " دستور عشاق" کا ترجمہ "سب رس" کے عنوان سے ملا وجہی نے کیا۔ پھر "طوطی نامہ "اور "کربل کتھا" ترجمہ ہوئیں۔ اب تک جو تراجم ہو رہے تھے ان میں ایک بڑا انقلاب تب دیکھنے میں آیا جب برصغیر پر انگریزوں کا راج مستحکم ہو چکا تھا اور یورپی تہذیب و تمدن ہندوستان پر حاوی ہو گیا تھا۔ اس دور میں ترجمہ کی ضرورت کو انگریزوں نے محسوس کیا اور اس حوالے سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور گل کرسٹ کی کوششوں سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۰۰ء میں قائم کیا گیا یہ کالج انگریزوں کو ہندوستانی زبان، تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج سے واقفیت کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے ہندوستانی ادیبوں کو کالج میں بھرتی کیا گیا جنہوں نے ہندوستانی داستانوی ادب کا بہت سا حصہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا فریضہ سر انجام دیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "یوں سلیس اور سادہ نثر میں مقبول عام قصوں اور داستانوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہندوستان بھر کے اہل علم اور اہل قلم کلکتہ میں جمع کر لیے گئے۔ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ کوئی بیس برس تک جاری رہا۔ اس دوران میں ۱۹ اہل قلم نے کوئی ساٹھ کے قریب کتابیں تحریر کیں۔"(۷)

ان تراجم میں میر امن کی "باغ و بہار" حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی" "آرائش محفل"، میر بہادر علی حسینی کی "نثر بے نظیر" کو بے پناہ شہرت ملی۔

اردو تراجم نگاری کے اس سفر کی اگلی کڑی علی گڑھ تحریک ہے جس کے بانی سر سید احمد خاں تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی ساکھ کو بہتر بنانے کے لیے عملی طور پر ایسے اقدامات اٹھائے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نئے اور پر امید مستقبل کی نوید دی اس لحاظ سے علی گڑھ تحریک مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی فکری تحریک ثابت ہوئی۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مغرب سے سائنسی علوم کے حصول کے لیے کتب کے تراجم کرنا شروع کیے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: "۱۸۶۳ء میں انہوں نے "سائنٹیفک سوسائٹی" کی

بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد انگریزی سائنسی کتب کے اردو تراجم کرنا تھا کہ لوگوں میں سائنس سے شغف پیدا ہو۔"(۸) یوں علی گڑھ تحریک نے سائنسی تعلیم سے برصغیر کے مسلمانوں کو روشناس کرایا اور جس سے نہ صرف مسلمانوں میں جدید علوم کو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا وہیں اردو تراجم کی روایت میں قابل قدر اضافہ دیکھنے کو ملا۔

تراجم کی روایت کو مزید دلی کالج نے جلا بخشی۔ اس کالج کی بنیاد مدرسہ غازی الدین میں ۱۸۶۵ء میں رکھی گئی۔ اس کالج کا مقصد ہندوستانی عوام کو جدید علوم سے آراستہ کرنا تھا۔ اس کالج میں مسٹر ٹیلر ،ڈاکٹر اشیر نگر اور مسٹر کارگل جیسی غیر ملکی شخصیات نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ دلی کالج میں تراجم کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "دلی کالج میں تراجم کی بدولت جس نشاۃ ثانیہ کا طلوع ہوا اس کے پیش پشت ڈاکٹر اسپر نگر کی محرک شخصیت ہی سرگرم عمل تھی۔ ان تراجم نے اردو زبان کی بے بضاعتی، کم مائیگی اور علمی مفلسی دور کرنے میں گرانقدر حصہ لیا۔ چنانچہ جب مشکل موضوعات پر اردو میں کتابیں چھپ کر سامنے آئیں تو لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔"(۹)

دلی کالج میں قائم دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے تحت فلسفہ، ریاضی، کیمیا، طبیعات، تاریخ و نباتات سمیت بہت سی کتابوں کے تراجم کیے گئے مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں ان تراجم کی ۱۲۸ کتب کی فہرست مرتب کی ہے۔ یہ سلسلہ جنوری ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں "انجمن اردو" کا شعبہ قائم کیا گیا۔ جسے بعد ازاں "انجمن ترقی اردو" کا نام دیا گیا۔ ابتداء میں اس کے سیکرٹری شبلی نعمانی تھے لیکن ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس انجمن کے تحت ایک لاکھ سے زائد جدید علمی، فنی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ اس ادارے کے تحت بہت سی علمی، فنی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ ان میں سب رس، شکنتلا، ذکر میر کے آسان اردو تراجم شامل ہیں۔ دارالترجمہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کا ادارہ بھی تراجم میں گرانقدر اضافے کا ذریعہ بنا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو نظام حیدر آباد نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی۔ اور اس میں اگست ۱۹۱۷ء کو شعبہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا۔ باقاعدہ مترجمین رکھے گئے۔ اس ادارے کی ترجمہ کے حوالے سے کی گئی خدمات کے بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

"اس ادارے نے مختلف درجوں کے نصاب کے لیے لگ بھگ ساڑھے چار سو کتابیں تیار کیں ۔ ان کتابوں میں ۲۹ تالیفات تھیں اور باقی ترجمہ تین سو انتیس کتابیں انگریزی سے، اکہتر عربی سے، سترہ فارسی سے، چھ جرمنی سے اور پانچ فرانسیسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔"(۱۰)

اس ادارے میں تقسیم ہند کے دارالترجمہ کی عمارت کو ختم کر دیا گیا لیکن اس کی خدمات کبھی بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ترجمہ کی روایت میں ان اداروں کی خدمات تو اجتماعی نوعیت کی ہیں لیکن انفرادی طور پر بھی بہت مترجم سامنے آئے جنہوں نے مختلف موضوعات اوراصناف ادب کی کتب کے اردو تراجم کیے۔ فہرست میں اگر ناول کی ضمن میں دیکھیں تو رتن ناتھ سرشار نے سرونٹس کے ناول کا ترجمہ "خدائی فوجدار" کے نام سے کیا۔ جبکہ عبدالحلیم شرر نے رینالڈ سن کے ناول کا ترجمہ "خوبی قسمت" کے عنوان سے کیا۔ مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ ناولوں کے تراجم خونی بھید، خونی جورو، خونی مصور، خونی عاشق اور بہرام کی دہائی کے ناموں سے کیے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک نے آر۔ ایل اسٹونٹس، انتظار حسین نے اسٹیفن کرین، محمد حسن عسکری نے اشروڈا اینڈرسن، انیس ناگی نے البیر کامید، اختر حسین رائے پوری نے پرل ایس۔ بک، محمد سعید نے جارج ایلیٹ، ابن انشاء نے ایڈا گر ایلن یو، اور جان سٹین بک، احمد ندیم قاسمی نے گوئٹے، سعادت حسن منٹو نے وکٹر ہوگو، قرۃ العین حیدر نے ہاورڈ فاسٹ اور عزیز احمد نے ہیر لڈ لیم کے ناولوں کو اردو میں ترجمہ کر کے اردو ناول میں نئے موضوعات و اسالیب کو متعارف کرایا ہے۔

ڈرامہ نگاری کے فن میں بھی ترجمہ نگاری کی روایت کا آغاز ولیم شیکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم سے ہوا۔ آغا حشر کاشمیری نے کنگ لئر کا ترجمہ "سفید خون" کے نام سے کیا۔ پھر ترجموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان ترجموں میں نمایاں جولیئس سیزر از عزیز احمد، رومیو جولیٹ از عزیز احمد اور عنایت اللہ دہلوی، اوتھیلا از عزیز حامد مدنی اور انطونی و قلوپطرہ از شان الحق حقی ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل فہرست ملتی ہے جس میں ڈاکٹر عابد حسین، آسکر وائلڈ کو مجنوں گورکھپوری، جارج برنارڈ شاہ کے ڈراموں کو مخدوم محی الدین، مولوی میر حسن، دوستو مگسی کو کمال احمد رضوی نے، ٹالسٹائی کو مجنوں گورکھپوری نے اردو میں متعارف کرایا اور یہ سلسلہ ہنور جاری ہے۔

افسانے کے میدان میں چیخوف، موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا گیا جبکہ افسانے کے مترجمین میں پریم چند، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، حجاب امتیاز علی، اختر حسین رائے پوری اور سید وقار عظیم کے نام نمایاں ہیں۔ یہ تو افسانوی ادب میں تراجم کی روایت بیان کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ منظوم اردو تراجم کی بھی مضبوط روایت ملتی ہے۔ ان تراجم سے اردو شاعری کو نئے موضوعات فکر و تخیل اور اظہار بیان کے نئے سانچے عطا کیے ہیں۔ اردو میں منظوم تراجم کی روایت کے حوالے سے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> "اردو ادب میں منظوم ترجمے کی روایت نظم طبع طبائی کی "گور غریباں" سے شروع ہوتی ہے جو گرے کی مشہور ایلجی کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا گیا اور پہلی بار جولائی ۱۸۹۷ء کے رسالہ "دلگداز" میں شرر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔"(۱۱)

اس کے بعد تراجم کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور گرے کی نظم "زمزمہ فصل بہار" سر الفریڈ لائل کی نظم کا ترجمہ "دولت خداداافغانستان" سامنے آئے انگریزی شعری ادب میں سے منتخب انگریزی نظموں کو ضامن کشوری نے "ارمغانِ فرنگ" کے عنوان سے ۱۹۰۱ء میں طبع کرایا۔ مولانا ظفر علی خان نے ٹینی سن کی نظم کو "ندی کا راگ" اور علامہ اقبال نے بھی انگریزی منظومات کے اردو میں تراجم کیے۔ علامہ اقبال کی اردو کلیات میں "ایک مکڑا اور مکھی" ، "ایک پہاڑ اور گلہری "از ایمر سن ، " ایک گائے اور بکری "، " بچے کی دعا" ، " ہمدردی " از ولیم کو پر، " ماں کا خواب "، " پیام صبح "از لانگ فیلو، "عشق اور موت "از ٹینی سن، "رخصت اے بزم جہاں "از ایمر سن، "پرندہ اور جگنو"، " پرندے کی فریاد"، "ماں کی تصویر "از ولیم کوپر منظوم اردو تراجم کی مثالیں ہیں۔ منظوم اردو تراجم کی روایت میں انجمن پنجاب کے روحِ رواں محمد حسین آزاد نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا انہوں نے ایک مضمون "نظم اور کلام موزوں" میں اس حوالے سے اردو شاعروں کو یورپ کے جدید تصورات شاعری سے آگاہی کا کہا تھا جس میں براہ راست اثر ان کی ڈاکٹر لائیٹنر سے قربت تھی۔ انہوں نے لارڈ لٹن کی نظم کا ترجمہ " اندھی پھول والی کا گیت " کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ ان کے خیالات کا اثر ہی تھا کہ ۱۸۱۷ء میں مولوی اسماعیل میرٹھی نے چار انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کیے تھے۔

اردو میں منظوم تراجم کی روایت کو "مخزن" نے بھی خوب آگے بڑھایا۔ "مخزن" کے مدیر شیخ عبدالقادر نے "مخزن" کے اجراء میں جن بنیادی مقاصد کو ملحوظ رکھا تھا ان میں سے ایک منظوم تراجم کو ترویج دینا بھی تھا۔ اس حوالے سے امتیاز ندیم لکھتے ہیں:

> "انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں، انگریزی نظموں کے با محاورہ ترجمے، اخلاقی نظمیں اور پرانے رنگ کی نظم کا انتخاب کیا تاکہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔"(۱۲)

"مخزن" نے اپنے مقصد کو عملی طور بھی ثابت کیا اور اس حوالے سے ملک کے بہت سے شعرا نے ۸۸ کے قریب انگریزی منظومات کے منظوم اردو تراجم کیے جو مختلف اوقات میں "مخزن" کے شماروں میں شائع ہوتے رہے۔ ان منظوم تراجم میں ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ حسرت موہانی نے "موسم بہار کا آخری پھول"، گرے کی نظم کا حبیب کشوری نے "گمنام نامور" اور ٹینی سن کی نظموں کے تراجم "بگل کی صدا" اور طالب بنارسی نے "دولت" اور ٹامس مور کی نظم "نور الہی" کے عنوان سے شیخ غلام محمد طور نے "فلسفہ محبت" کے نام سے شیلے کی اور "کوئل" از ورڈز ورتھ کی نظموں کے تراجم کیے۔ مولانا ظفر علی خان نے "بیٹے کا گیت" از کیلنگ، "ندی کا راگ" از ٹینی سن اور "کتے سے سبق پڑھو وفا کا" از ورڈز ورتھ، جبکہ نادر کاکوروی نے "گزرے زمانے کی یاد میں" اور "مرحومہ کی یاد میں" از ٹامس مور سے منظوم تراجم کے سرمائے میں اضافہ کیا۔

امیر چند بہار نے "نسیم مغرب" کے عنوان سے انگریزی کی ۲۶ مایہ ناز نظموں کے منظوم تراجم کیے ہیں۔ یہ نظمیں ترجمہ شدہ ہیں لیکن ان کو جس خوبی سے ترجمہ کیا گیا ہے ان پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔اس کے علاوہ حسین الدین احمد نے بھی "ساز مغرب" کے عنوان سے منظوم اردو تراجم کی ۹ جلدیں مرتب کی ہیں جن میں اردو کے معروف شعراء نے جن انگریزی نظموں کے اردو تراجم کیے ہیں ان کو یکجا کیا۔ ان تراجم کے حوالے سے حسن الدین احمد لکھتے ہیں:

> "دوسری زبانوں کی نظموں کے منظوم تراجم کو اردو شاعری کی ایک مستقل صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں انگریزی نظموں کے تراجم کی تعداد زیادہ ہے۔ ان ترجموں نے اردو ادب کو جدید خیالات، نئی تشبیہات و استعارات دیے اور اردو شاعری کو ایک نئی جہت میں وسعت دی۔"(۱۳)

اس کے بعد تراجم کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور گرے کی نظم "زمزمہ فصل بہار" سر الفریڈ لائل کی نظم کا ترجمہ "دولت خدادافغانستان" سامنے آئے۔ انگریزی شعری ادب میں سے منتخب انگریزی نظموں کو ضامن کشوری نے "ارمغانِ فرنگ" کے عنوان سے موسوم کیا یوں اردو منظوم تراجم کی جب بھی بات کی جائے گی تو "ساز مغرب" کا مطالعہ نہایت جامع تصور کیا جائے گا۔ منظوم تراجم کی روایت میں علامہ اقبال، محمد حسین آزاد، مولانا ظفر علی خان سے لے کر بانکے بہاری لال، امیر چند بہار، حنیف کیفی، سید شاکر علی جعفری، اور سید علی حسنین نقوی اور بہت سے شعراء نے اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے اور کلاسیکی جدید انگریزی شاعروں کے کلام کو اردو میں منظوم صورت میں منتقل کر کے نہ صرف انگریزی شاعری سرمایہ ادب سے اردو شاعری کو نئی فکر اور جلا بخشی ہے۔ منظوم اردو تراجم کا یہ سلسلہ عہد جدید میں بھی جاری ہے اور اس سے اردو شعر و ادب کو جو فائدہ پہنچ رہا ہے وہ اسے ہمیشہ گراں قدر سمجھا جائے گا اور اس میں مسلسل اضافہ اس بات کا غماز ہے کہ عہد حاضر کا اردو شاعر جدید یورپی شعری روایت و اسلوب سے کس طرح ہم آہنگ ہے۔

ترجمہ ایک ایسا فن ہے جو بیک وقت دو زبانوں پر مہارت چاہتا ہے کیونکہ ترجمہ کے ذریعے ہی ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے فن کے کچھ تقاضے اور اصول ہیں جن کو بروئے کار لاتے ہوئے ترجمہ کا عمل کیا جاتا ہے چونکہ ترجمہ میں ایک ہی وقت میں دو زبانوں کو بروئے کار لایا جارہا ہوتا ہے اس لیے مترجم کو متن، اس کے اصل مصنف کی منشاء اور اپنی زبان، اس کے اصول و ضوابط اور پھر اپنے قاری کی ذہنی اور علمی سطح کو بھی مد نظر رکھنا ہوتا ہے کیونکہ اسی صورت میں ترجمہ کا فن بہتر طور پر سر انجام دیا جا سکتا ہے۔ ترجمہ ایک وسیع اور مشکل فن ہے۔ اس لیے اس کو جہاں مختلف اقسام اور طریقہ کار کے لحاظ سے مختلف خانوں میں بانٹا گیا ہے وہیں اس کے حوالے سے بہت سے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایک اجنبی زبان کے فن پارے کو اپنی زبان میں مکمل مفہوم کے ابلاغ کے ساتھ ترجمہ کرنا کسی طور بھی آسان نہیں ہے۔ مختلف ناقدین نے ترجمہ کے مسائل کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات و نظریات پیش کیے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "کئی ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہیں مگر کسی قابل ذکر مصنف نے کوئی واضح کتاب یا ایسی مفصل تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی جو ترجمے کے بنیادی مسائل کو ساری اور سہولتوں کو سامنے رکھ کر ان کا حل بنا سکے اور جس سے

ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی ڈگر صاف نظر آئے اپنی حدود اور اپنی ذمہ داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی ترتیب کے لیے استعمال کر سکیں۔"(۱۴)

اس حوالے سے ترجمہ کے بڑے مسائل جو سامنے آتے ہیں۔ ان میں سب سے بنیادی تو ایک سے زائد زبانوں پر عبور کا ہے کیونکہ ایک اچھا مترجم وہی ہو گا جو مختلف زبانوں پر مکمل مہارت رکھتا ہو گا اور اگر بہت سی زبانوں پر نہیں تو کم از کم ان دو زبانوں پر ماہرانہ قدرت ضروری ہے ایک جس زبان کا متن ترجمہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرا جس زبان میں اس فن پارے کے منتقل کرنا ہے اگر مترجم اور زبانوں پر عبور نہیں رکھتا ہو گا تو ترجمہ کا عمل درست طور پر نہ ہو سکے گا۔

اب یہی نہیں ایک زبان میں بیک وقت بہت سی دیگر زبانوں کے اثرات و مزاج کو بھی دخل ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم اپنی زبان اردو کو ہی دیکھیں تو اس کی تشکیل و ترقی میں مختلف ادوار میں مختلف اقوام اور ان کی زبانوں کا اثر رہا ہے جیسا کہ اردو فارسی، عربی اور دیگر مقامی زبانوں کے الفاظ و اثرات واضح طور پر موجود ہیں اس لیے اگر کوئی اردو میں ترجمہ کرنا چاہے تو اس کو ان دیگر زبانوں کے بارے میں بھی معلومات ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اسی صورت میں جامع ترجمہ کر سکے گا ایسے ہی اگر اردو مترجم انگریزی یا فرانسیسی یا کسی دیگر زبان کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اس زبان کی تاریخ اور تشکیلی عناصر اور دیگر زبانوں کے اس زبان پر اثرات کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے جبکہ مترجم کی ان زبانوں سے عدم واقفیت اس کے لیے مسائل کا باعث بنے گی اس حوالے سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری لکھتے ہیں:

"اگر ترجمہ کرنے والا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کے راز سے ناواقف ہے تو وہ لفظ بہ لفظ لغوی ترجمہ کرتا چلا جائے گا اور وہ جو مفہوم اور اشارے ان الفاظ کی پشت سے جھانک رہے ہیں ترجمے میں غائب ہو جائیں گے۔"(۱۵)

یوں ترجمے کا اصل مقصد تو ختم ہو کر رہ جائے گا۔ جب مترجم خود ہی متن کے اصل مفہوم سے واقف نہ ہو گا تو قاری کے لیے اس کا جاننا تو پھر ناممکن ہے۔ پھر مترجم کو ان دونوں زبانوں کی اصطلاحات چاہے قانون کے حوالے سے ہوں، فنون لطیفہ کے بارے میں، صحافت یا سیاست کے بارے میں ہوں یا پھر ادب سے متعلق ہوں کیونکہ وہ جس بھی موضوع کے فن پارے کا ترجمہ کر رہا ہو گا اسے نہ صرف اس اجنبی زبان کی اصطلاحات کا علم ہونا چاہئے بلکہ اپنی زبان میں موجود ان اصطلاحات کے متبادل کا بھی بہتر

طور پر معلوم ہونا چاہیے۔ اب اصطلاحات کا علم ہونا کیوں ضروری ہے اس حوالے سے وحید الدین سلیم لکھتے ہیں:

> "اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔" (۱۶)

یوں اصطلاحوں سے عدم واقفیت کی وجہ سے مترجم کو بہترین اور قابل تفہیم ترجمہ کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر وہ اصطلاحات سے واقف ہو گا تو ترجمہ کا عمل اس کے لیے بہت حد تک آسان ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کی لغت، مترادفات اور محاورات بھی ترجمہ کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں کیونکہ بعض اوقات ہماری لغت میں مطلوبہ لفظ کا معنی وہ نہیں ہوتا جس معنی میں دوسری زبان میں استعمال ہوا ہے اب اگر اس حوالے سے ہم اردو اور فارسی زبان ہی کی مثال لیں تو بہت سے الفاظ مختلف معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اردو میں لفظ "رقم" کا معنی "پیسے" ہے جبکہ فارسی میں "تحریر کرنا" ہے۔ اسی طرح زدراہ کا اردو میں معنی "چاول / برنج شیریں" جبکہ فارسی میں "انڈے کی زردی" ہے۔ یونہی احاطہ کا اردو معنی "جگہ" اور فارسی میں "محاصرہ" ہے۔ مزید دیکھیں تو رشتہ کا اردو میں معنی "تعلق" ہے جبکہ یہی لفظ فارسی میں "سویاں" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح اور بھی بے شمار الفاظ اس ضمن میں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں جو بالکل مختلف معنی اور تناظر میں استعمال ہوتے ہیں اور یوں لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو جس دقت کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا اندازہ واضح طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر محاورات کی بات کریں تو ہر زبان کے محاورات اور روز مرہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کے اپنی زبان میں متبادل تلاش کرنا کہ بالکل وہی معنی دیں جس میں اصل مصنف نے استعمال کیے ہیں، ترجمہ کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ پھر بعض اوقات مطلوبہ محاورہ کا متبادل اپنی زبان میں ملتا ہی نہیں ہے یوں اس کے ترجمہ کے لیے مناسب محاورہ کی تلاش میں مترجم کو خاصی تحقیق سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے اس حوالے سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری لکھتے ہیں:

> "جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے ممکن ہے اس میں اصل عبارت جیسے ٹکے بندھے الفاظ یا مستقل اصطلاحیں اور محاورات یا ترکیبیں موجود نہ ہوں۔ اگر زبان کا دامن

ایسے اجزا سے خالی ہے تو ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے ذمہ داری
ادا ہو جائے تو ترجمے کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔"(۱۷)

یوں مترجم کی صلاحیت بھی بڑھ جاتی ہے لیکن یہ نکتہ اہم ہے کہ ترجمہ کرنے والے میں ذوق و شوق کتنا ہے اس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے کیونکہ اگر اس کا مطالعہ کم ہو گا اور دیگر زبانوں پر عبور نہ ہو گا تو اس کے لیے لفظی ترجمہ کے علاوہ اور کوئی ترجمہ ممکن نہ ہو گا اور لفظی ترجمہ میں وہ محض لغت پر اکتفا کرے گا لیکن ترجمہ کرنے کے دوران ایسا مرحلہ بھی در پیش آ سکتا ہے جب لغت اس کے لئے ناکافی ثابت ہو جائے گی اور درست ترجمہ اور مفہوم کی ترسیل ممکن نہ رہے گی۔ یوں اصل متن کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔ یہ ترجمہ کے مسائل میں سے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ کے طور پر ظاہر ہوتا ہے اور یہ مسئلہ مترجم کی ذاتی استعداد اور دوسری زبانوں کے علوم کے وسیع اور گہرے مطالعہ ہی کی بدولت حل ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی اہم مسئلہ ہے کہ بعض اوقات مترجم زبان کے ارتقائی عمل سے ناواقف ہوتا ہے وہ کوئی بھی کتاب اٹھاتا ہے اور اس کا ترجمہ شروع کر دیتا ہے اور اسی زبان میں ارتقائی عمل کی وجہ سے الفاظ محاورات میں جو تبدیلیاں پیدا ہو گئیں ان سے عدم واقفیت کی وجہ سے وہ ان کو سمجھ نہیں پاتا اور ترجمہ درست طریقے پر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم کو اس زبان بالخصوص اس خاص موضوع پر دسترس ہو اس موضوع کے حوالے سے جتنی بھی ضروری معلومات درکار ہیں وہ سب سے واقف ہو کیونکہ اس طرح ہی وہ ترجمہ کا حق ادا کر سکتا ہے اور اپنی زبان کے سرمایہ میں اضافے کا بھی باعث بن سکتا ہے۔ پھر مترجم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اگر زیادہ نہیں تو بالخصوص اس مصنف کی شخصیت، اسکی دیگر تصانیف، اسلوب اور موضوعات سے واقف ہو جس کی کتاب کو وہ ترجمہ کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ بنیادی معلومات اس کے لیے ترجمے کی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو حل کر سکتی ہیں۔

ترجمہ کرتے ہوئے سب سے اہم بات اصل موضوع اور متن کے مفہوم تک رسائی ہے اور پھر اس کا قریب ترین ترجمہ کر کے اپنے قاری کے لیے قابل فہم بنانا ہے کیونکہ اسی صورت میں وہ ترجمہ فائدہ مند ہو گا اس لیے یہ خیال رکھنا ہو گا کہ کیا متن میں کوئی پوشیدہ معنی ہیں یا وہ متن کثیر المعنی ہے اور اگر اس کے متن میں بہت سے معنی موجود ہیں تو مصنف کا اصل مطمع نظر کیا ہے اور ترجمہ کے دوران یہاں مترجم کو اپنی ذہنی اپج اور زبان پر ماہرانہ عبور دکھانے کی ضرورت ہو گی۔

ترجمے کے لیے مصنف جس موضوع یا صنف ادب کو چنتا ہے اس میں نہ صرف یہ کہ اس کی ذاتی دلچسپی کو دخل ہونا چاہئے بلکہ اس خاص میدان میں اس کا مطالعہ گہرا اور وسیع بھی ہونا چاہئے اور اس خاص میدان میں اس کو دیگر زبانوں کے بڑے بڑے ادباء یا شعرا سے بھی واقفیت ہو کیونکہ ترجمہ کی ضمن میں نثری اور شعری / منظوم دونوں طرح کے تراجم شامل ہوتے ہیں اس لیے اگر یہ لازم ہے کہ منظوم ترجمہ کرنے والا شاعری اور اس کے اصولوں کو سمجھنے والا ہو۔ شاعری کے لطیف اور نازک خیالات اور باریک بینیوں کو سمجھنے والا ہو کیونکہ اس طرح ہی وہ شاعری میں استعارات، تلمیحات اور تشبیہات سے واقف ہو گا ان کے استعمال کا فن خوب جانتا ہو گا تو یقیناً ترجمہ تخلیق کا درجہ بھی حاصل کر لے گا۔ شعری تراجم کے حوالے سے یہ مسئلہ اہم ہے کہ اگر مترجم اپنی اور دوسری زبان کے شعری عروضی نظام سے واقف ہو گا تب ہی ترجمہ درست ہو سکے گا کیونکہ ہر زبان کا عروضی نظام مختلف ہوتا ہے اس لیے مترجم اگر شاعر ہو گا تو اپنے شعری نظام اور عروضی اصول و قواعد کو خوب سمجھتا ہو گا لیکن اس کے بعد اس کے لیے دوسری زبان کے شعری نظام کو سمجھنا بھی اہم ہے کیونکہ اس صورت میں ہی وہ نظم کا ترجمہ نظم کی صورت میں کر سکے گا اور شعری تاثر برقرار رہے گا۔ شاعری کا ترجمہ شاعری ہی کی صورت میں کرنے کے حوالے سے پروفیسر جیلانی کامران اپنے مضمون "شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات" میں کولرج کی رائے بیان کرتے ہیں جس سے شعری تراجم کے بارے میں بڑا واضح اصول پتہ چلتا ہے۔

> "کولرج کی رائے میں لازوال شاعری وہی ہے جو ترجمے کے عمل سے گزر کر شاعری رہے اور ترجمے کے عمل کے بعد اصل شعری رہے اور ترجمے کے عمل کے بعد اصل شعری متن کا مافیہ ہی شاعری کی نشاندہی کرتا ہے اس اعتبار سے کسی شعری متن کا قافیہ اصل شاعری ہے۔"(۱۸)

شاعری کا ترجمہ کرتے ہوئے شاعرانہ اسلوب کو جہاں قائم رکھنے کی ضرورت ہے وہیں مفہوم اور معنی تک درست رسائی نہایت ضروری ہے کیونکہ اصل مفہوم کا منتقل ہونا سب سے اہم ہے اور اس کے لیے اپنی زبان کے موجود سب سے بہتر اور مناسب الفاظ اور مترادفات کا استعمال کرے۔ مترجم اصل شعری متن کو اپنی زبان میں منتقل کر سکے گا اس کے ساتھ ساتھ تراجم کی ذیل میں افسانوی ادب شامل ہے۔ افسانوی ادب داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ شامل ہیں۔ ابتدا سے لے کر آج تک عالمی ادب کی بہترین تخلیقات کے تراجم کا سلسلہ جاری ہے اور دنیائے ادب کا بہت سا افسانوی ادب اردو میں ترجمہ ہو چکا

ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن ان تراجم کے حوالے سے بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسا کہ سب سے پہلے تو دو مختلف زبانوں کا ادب جو دو مختلف تہذیبی و ثقافتی پس منظر کو پیش کرتا ہے جہاں کی زبان، رسم و رواج، تہذیب و نظریات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو ان دونوں مختلف ثقافتوں کو مد نظر رکھ کر ترجمہ کرنا ہو گا۔ اس حوالے سے انتظار حسین اپنے مضمون "افسانوی ادب کے تراجم۔ مسائل اور مشکلات" میں لکھتے ہیں:

> "ایسی صورت میں دو تہذیبیں ہی نہیں دو نثری روایتیں بھی ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتی ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نثری روایت کا ذائقہ ترجمے میں ضائع نہ ہو جائے اور اس نثری روایت کے اندر لکھنے والے کا جو اپنا ایک اسلوب ہے وہ بھی جس حد تک منتقل ہو سکتا ہے، منتقل ہو جائے۔"(۱۹)

مترجم کو تہذیب اور نثری روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ کرنا ہو گا اور اصل متن اور مصنف کی منشا کو یوں اپنی زبان میں ڈھالنا ہو گا کہ اصل متن کا لطف ترجمہ کی صورت میں ملے۔ مصنف کا اسلوب اور انداز ترجمہ کے دوران مترجم کے انداز بیان میں کہیں چھپ نہ جائے۔ ناول، افسانہ کا ترجمہ کرتے ہوئے انہیں ان کا خلاصہ نہ بنا دیا جائے بلکہ مترجم اگر افسانہ نگار یا ناول نویس ہو گا تو وہ ان اوصاف سے متصف ہو گا، یوں ترجمہ کرنے کے دوران وہ ایک ماہر تخلیق کار کی صورت مسائل پر بڑی حد تک قابو پالے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی فکر کی بلندی اور تخیل بھی ترجمہ میں بہت ضروری ہے۔ افسانوی ادب کے ترجمہ کے حوالے سے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے بہت جامع بات لکھی ہے:

> "افسانوی ادب کے ترجمے میں فقروں کے آہنگ اور اسلوب کا ترجمہ بھی ہونا چاہیے اور افسانے یا ناول کی پوری فضا بھی ترجمے میں منتقل ہونی چاہئے کہ محض اسی طور ترجمہ تخلیقی سطح کا حامل ہو سکتا ہے تو اسی صورت میں کچھ نہ کچھ اجنبیت اور کھردرے پن کا ہونا لازمی امر ہے۔"(۲۰)

مجموعی ترجمہ کرتے ہوئے اصل میں نقل کا پرتو ہونا چاہیے۔ جس میں تمام امکانات کو بھی بیان کر دیا جائے۔ اصل مصنف کے فن، فکر کو پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دیا جائے اور اصل متن مفہوم اور خوبصورتی کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جائے۔ تب ہی ترجمہ کا فن اپنے اصول

وضوابط بھی پورے کر سکے گا۔ ترجمہ نگاری بطور فن ترقی بھی کر سکے گا اس راہ میں جتنی بھی مشکلات ہیں ان سب سے مترجم کو نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ اوراپنی مسلسل محنت، وسیع مطالعہ اور تخلیق کی مدد سے عالمی ادب کے بہترین فن پاروں کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اس کے ادبی سرمائے میں اضافے کا باعث بنے گا۔

حواشی:

۱۔ جیلانی کامران، ترجمے کی ضروت، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ: خلیق انجم، دہلی: ثمر آفسٹ پریس، ۱۹۹۶ء، ص:۲۷

۲۔ شہباز حسین، ترجمہ کی اہمیت، مشمولہ، فن ترجمہ نگاری، مرتبہ: خلیق انجم، ص:۶۳

۳۔ جیلانی کامران، ترجمے کی ضرورت، مشمولہ: فن ترجمہ نگاری، مرتبہ: خلیق انجم، ص:۶۷

۴۔ حاجی احمد فخری، اردو تراجم، مشمولہ ادبی مجلہ اردو، دکن: ۱۹۲۹ء، ص:۵۹۴

۵۔ حامد بیگ، مرزا، ترجمے کا فن، (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء) ص۹

۶۔ فاخرہ نورین، ڈاکٹر، ترجمہ کاری، (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اردو، ۲۰۱۵ء) ص۹۷

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء) ص۳۰۰

۸۔ ایضاً، ص۳۳۱

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۴ء) ص۲۸۷

۱۰۔ خلیق انجم، اردو ترجمے کا ارتقا، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ: خلیق انجم، (نئی دہلی: ثمر آفسٹ پرنٹرز، ۱۹۹۶ء) ص۲۰

۱۱۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ترجمے کا فن، (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء) ص ۳۸

۱۲۔ امتیاز ندیم، ماہنامہ "مخزن" اشاریہ اور ادبی خدمات، دہلی: بھارت آفیسٹ پریس، ۲۰۰۷ء ص۲۸

۱۳۔ حسن الدین احمد، ساز مغرب (اردو آہنگ میں) جلد اوّل (حیدر آباد: ولا اکیڈمی ۱۹۷۶ء)

ص ا

۱۴۔ ظ، انصاری، ڈاکٹر، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ: ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ، ڈاکٹر خلیق انجم، ص: ۷۷

۱۵۔ ظ، انصاری، ڈاکٹر، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، ص: ۸۷

۱۶۔ وحید الدین سلیم، وضع اصطلاحات، (اورنگ آباد دکن: انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۱ء) ص ۲

۱۷۔ ظ، انصاری، ڈاکٹر، ترجمے کے بنیادی مسائل مشمولہ "ترجمہ کا فن اور روایت، ص: ۱۰۳

۱۸۔ جیلانی کامران، پروفیسر، شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات مشمولہ، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ: اعجاز راہی، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء) ص ۲۲۹۔۲۲۸

۱۹۔ انتظار حسین، افسانوی ادب کے تراجم مسائل اور مشکلات، مشمولہ، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ: اعجاز راہی، ص ۲۰۷

۲۰۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، افسانوی ادب کے تراجم۔ مسائل اور مشکلات، مشمولہ اردو زبان کے ترجمے کے مسائل، مرتبہ: اعجاز راہی، ص: ۲۰۲